© rasailojaraid.com

قطعِ ید

(از جناب حافظ سراج الدین محمود صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی)

ایک صحبت میں میرے ایک دوست نے جو ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی اور صالح نوجوان ہیں دریافت فرمایا :۔

" کیا چور کا ہاتھ کاٹ ڈالنے کی سزا بہت زیادہ سخت نہیں ہے ؟ بھوک اور فاقہ کشی سے مجبور ہو کر ایک آدمی اگر پیٹ بھرنے کے لیے اپنی خوراک کے قابل کچھ چُرا لے تو کیا اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جانا چاہیئے ؟"

رحم و کرم اور شفقت و محبت کے جذبات کا یہ اظہار اگرچہ ایک اجتہادی رنگ لیے ہوئے تھا مگر ان جذبات کی روح ہی نہیں بلکہ الفاظ تک علمائے سیاست و مصلحین فرنگ سے مستعار لیے ہوئے تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو Victor Hugo نے اِنہی جذبات و احساسات کو اپنی مشہور عالم تصنیف مصیبت زدہ Les Misérables میں ایسے غمناک پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ قارئین کا اس سے متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکنات سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علمائے فرنگ کا ایک طبقہ نیک نیتی سے یورپ کے اُن قوانین کی جو دورِ تاریک کی یادگار تھے، سختی و شدّت کم کرنے میں ساعی رہا ہے۔ لیکن سیاسیئن مغرب کا ایک ایسا گروہ بھی وہاں ہمیشہ موجود رہا ہے جو کسی دیانت داری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی استعمار پرستانہ اغراض کے حصول کی خاطر ہر اسلامی نظریہ و قانون کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھے ہوئے ہے۔ کوئی موقع اور محل ایسا نہیں جہاں اس طبقہ کے افراد اپنی زہر چکانی سے باز رہتے ہوں۔ تاریخ کا مضمون ہو یا جغرافیہ کا، علم معشیت کا مسئلہ ہو یا معاشرت کا، نہایت ہی صفائی اور خوبصورتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ اسلام کی مخالفت کرجانا اور تریاق میں زہر ملاکر دُنیا کے سامنے پیش کرنا، تاکہ اس زہر کو آسانی سے نوش کیا جاسکے، ان کا شیوہ ہوتا ہے۔

دشمنانِ اسلام تو اپنی فوقیت و برتری اور قوتِ استبداد کو قائم رکھنے کے لیے دانستہ دُنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے پر آمادہ و مستعد رہتے ہی ہیں۔ لیکن افسوس تو فرزندانِ اسلام پر ہے جو حقیقتِ حال کو سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت اپنے اعتراض کی اہمیت کو بھی قطعاً نہیں سمجھتے بلکہ "ہز ماسٹرز وائس" کی طرح جو سُنا ہے بس وہی بول دیا کرتے ہیں۔ اگر اس قسم کے شکوک و شبہات خارجی اور فاسد اثرات کی پیداوار نہ ہوتے بلکہ ہماری اپنی ذہنی بلندی اور اُپج کا ہی نتیجہ ہوتے تو بھی بسا غنیمت تھا کہ اس صورت میں کم از کم یہ تو امید کی جاسکتی تھی کہ جب شئے لطیف موجود ہے تو جس طرح وہ شبہات پیدا کرتی ہے اسی طرح تھوڑی سی محنت اٹھاکر شبہات کا حل بھی نکال لے گی۔

اس قسم کے معترضین کبھی یہ خیال نہیں کرتے کہ اسلام ایک نظام ہے جو ایک خاص قسم کا تمدن اور مخصوص قسم کی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ اس نظام کی تمام کڑیاں مسلسل اور باہم مربوط ہیں۔ کسی ایک کڑی کو اس پورے نظام یا سلسلہ سے الگ کر کے مطالعہ کرنا حقیقتِ حال سے بےخبری اور جہالت کی دلیل ہے۔ ایسا کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا تھا کہ اسلام بھی بعض دوسرے مذاہب کی طرح چند غیر مربوط اخلاقی اصولوں کا مجموعہ ہوتا یا صرف مواعظ حسنہ کا ایک دفتر، جو عملی زندگی میں ہندوستان کے عقیدۂ اہنسا اور عیسائیت کے عقیدۂ مسکنت کی طرح ناممکن العمل ہوتا۔ مگر جب کہ اسلام ایک مرتب اور مربوط نظام ہے تو اس کے اجزا کو الگ الگ نہیں بلکہ پورے مجموعہ کے ساتھ دیکھنا ہی مشاہدۂ حقیقت کا صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔ قطع ید ہو یا کوئی اور حکم، آپ اس کو اس کے صحیح ماحول Proper environments میں مطالعہ کیجیے۔ آپ کے شکوک و شبہات خود دُور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جائیں گے۔

قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ خیال کی وضاحت کی جائے اس سوال کی تحقیق کر لینی چاہیے، اور یہ ایک اہم سوال ہے کہ انسانی سوسائٹی میں آخر چوری ہوتی کیوں ہے؟ اس کے متعدد اسباب و وجوہ ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ مگر ان سب کو دو بڑی اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کی چوری وہ ہے جو حاجت اصلیہ کے بغیر محض حرص، حسد، آسان طلبی، یا انتقام کے جذبات کے ماتحت کی جاتی ہے۔ اور دوسری قسم کی چوری وہ ہے جس کی محرک حقیقی حاجت مندی ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کی چوری کے متعلق تو ہم سمجھتے ہیں کہ شائد کوئی صاحب عقل آدمی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس کے مرتکب کو کسی قسم کے رحم کا مستحق سمجھتا ہو، یا اس کے ساتھ نرم برتاؤ کی سفارش کرنا پسند کرے، کیونکہ اگر اس باب میں نرمی کی جائیگی اور اسے پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے گا تو ملک میں ظالم اور مظلوم دو ایسے طبقے پیدا ہو جائیں گے جن میں سے ایک طبقہ اپنے ظلم و جور اور طغیان و سرکشی سے دوسرے طبقہ کے لیے زندگی تنگ کر دیگا، اور جب دوسرا طبقہ اس ظلم سے تنگ آکر جواب میں ہاتھ اٹھائیگا تو فساد، بدامنی اور خونریزی سے خدا کی زمین بھر جائے گی۔ ہاتھ کٹنے کی صورت میں تو دو چار کے ہاتھ کٹنے پر فتنہ فرو ہو سکتا تھا لیکن اب دو چار نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں کی گردنیں کٹنے پر بھی شر اور فساد کا سرچشمہ مشکل ہی سے بند ہو سکیگا لہذا ایسی چوری کے حق میں تو کوئی شخص رحم اور نرمی کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

اب صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے کہ افلاس و ناداری یعنی بھوک اور فاقہ کشی سے مجبور ہو کر جب محنت و مشقت کے باوجود بھی انسان اپنے اور اپنے بال بچوں کے سر چھپانے کو جگہ، تن ڈھانکنے کو کپڑا، اور پیٹ بھرنے کو روٹی نہ پا سکے تو لامحالہ اسے چوری جیسی ذلیل اور قبیح عادت کا سہارا لینا پڑ جاتا ہے۔ خصوصاً جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ اور اُس کے بال بچے تو فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، اور اسی کے مانند دوسرے انسان جو کسی طرح بھی اس سے بہتر و برتر نہیں، اس کی بہ نسبت کم محنت کر کے یا بالکل محنت نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر کے بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، بلکہ خداوندی نعمتوں کو اسرافِ بے جا اور عیاشی میں اڑا رہے ہیں تو اس کا دل اپنی بے نتیجہ عرق ریزی و جفاکشی سے پھر جاتا ہے، اور وہ کہتا ہے کہ جب میں سیدھے طریقہ سے اس غیر منصفانہ نظام کو پلٹ نہیں سکتا تو کیوں نہ چوری کے ذریعہ سے تقسیمِ دولت کے اس فاسد نظام کو توڑ ڈالوں؟ جب دولت کا یہ دریا ہر پھر کر ایک ہی طبقہ میں بہے جا رہا ہے اور مجھ جیسے پیاسوں کو اس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا جاتا تو کیوں نہ میں خفیہ طریقہ سے یا زبردستی اس کے اندر سے ایک نالی اپنے لیے بھی نکال لاؤں؟

جو شخص اس ضرورت کی بنا پر مجبوراً چوری کرتا ہے، اس کا معاملہ یقیناً ہمدردانہ غور کا مستحق ہے۔ اگر اسلام نظامِ سرمایہ داری کی طرح تقسیمِ دولت کے اس ظالمانہ طور طریق کو باقی رکھتا ہے اور پھر ضرورت سے مجبور ہو کر چوری کرنے والوں کے ساتھ اُس نرمی کا سلوک بھی نہیں کرتا جسے نظامِ سرمایہ داری نے اختیار کیا ہے تو بلاشبہ اُسے ظلم سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنے کا سامان بھی نہ کرو اور جب وہ حاجت سے مجبور ہو کر چوری کریں تو ان کے ہاتھ بھی کاٹ دو، اسے کون نہ ظلم کہیگا۔ لیکن اگر اسلام انسان کی حاجاتِ اصلیہ کا سوال پہلے حل کرتا ہے اور پھر اس حل کو عملاً قائم کرنے کے بعد ان مفسدوں کے ہاتھ بیکار کر دینا چاہتا ہے جو اپنی حرص یا حسد یا آسان طلبی یا انتقام کی خاطر تقسیمِ دولت کے عادلانہ نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں، تو اس پر اعتراض کرنے والے کو زبان کھولنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ وہ انسانیت کی دوستی میں زبان کھول رہا ہے یا دشمنی میں۔

اب قبل اس کے کہ ہم اسلام کے اس تجویز کردہ عمل سے بحث کریں، ہمیں ایک نظریہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ سوسائٹی میں یہ غیر مساوی حالت اور غیر منصفانہ تقسیم کن وجوہ سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ان وجوہ کے معلوم ہو جانے کے بعد ہمارے لیے اس حل کو سمجھ لینا نسبتاً زیادہ آسان ہو جائیگا۔

۱ انسانی سوسائٹی میں غیر مساوی حالت پیدا ہونے کی صرف تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ قلبی، ذہنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و جسمانی۔ ہم ان کی مزید تشریح کرتے ہیں:۔

قلبی وجہ:۔ یہ کہ عقیدۃً انسان ایسے طبقوں میں تقسیم ہو جائے جن میں سے بعض اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز اور اعلیٰ تصور کرتے ہوں اور بعض اپنے آپ کو حقیر اور ادنےٰ خیال کرتے ہوں۔ اس کی مثالیں ہندوستان میں خاصکر پائی جاتی ہیں۔ دیگر غیر اسلامی ممالک میں بھی دولت کی وجہ سے انسان کو اعلےٰ اور ادنےٰ طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں حقیقی اسلامی روح کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے عملاً اسلامی طبقات بھی اس مصیبت میں مبتلا ہو چکے ہیں، اگرچہ عقیدۃً وہ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

ذہنی وجہ:۔ پیدائشی طور پر انسان اپنی قابلیتوں کے اعتبار سے بعض انسانوں کے مقابلہ میں فائق تر ہوں اور اس بنا پر ان کے معاشرتی درجے اور مادی حالات میں بھی تفاوت پایا جائے۔

جسمانی وجہ:۔ زیادہ اثر و رسوخ اور زیادہ طاقت رکھنے والے لوگ دولت عامہ کی تقسیم اس طرح کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ان کو دوسروں سے بہت زیادہ حصہ ملے اور خاص حدود کے اندر عادلانہ تقسیم Equitable distribution of wealth نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے محروم و مفلس یعنی مزدور، اور دولتمند و سرمایہ دار طبقوں میں، یا وراثتی طور پر حاکم و محکوم طبقوں میں سوسائٹی تقسیم ہو جائے۔

اسلام نے ان مصائب کا جو علاج تجویز کیا وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) سب سے اوّل اسلام نے انسان کو اس کی اصلیت یاد دلائی۔ اس کی زندگی کی غرض و غایت اور مقصد کو کھول کر بیان کر دیا۔ اسے بتلایا کہ تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، یعنی تم میں نہ کوئی افضل اور اعلیٰ ہے اور نہ کوئی ادنےٰ اور حقیر۔ تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔ اگر افضل ہیں تو سب کے سب ہی افضل ہیں، کیونکہ خداوند قدوس نے نوع انسانی کو نہ صرف اشرف المخلوقات ہی بنایا ہے بلکہ اس کو دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بھی بنا کر بھیجا ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً - اس لیے تم میں کوئی بھی ذلیل نہیں - لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ط اور لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ -

اسلامی سوسائٹی اسی بنیادی فکر کی اساس پر اٹھائی گئی ہے اور مسلمان جو اس فکر پر ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ - تم سب برابر کے بھائی ہو۔ تمہارے درمیان سے اونچ نیچ، چھوت چھات، بندگی و خواجگی اور پاکی و ناپاکی کے سارے فروق و امتیازات اٹھا دیے گئے۔ تم میں سے کوئی نیچ نہیں۔ سب اونچے ہیں۔ کوئی ناپاک نہیں۔ سب پاک ہیں۔ کوئی ادنیٰ اور حقیر نہیں۔ سب عزت والے اور شریف ہیں۔ تمہارے درمیان اگر کوئی فرق ہے تو صرف اخلاق اور عمل صالح کے اعتبار سے ہے - إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ - اس اعتبار سے جو بڑھا ہوا ہے وہ بلاشبہ افضل ہے اور جو گھٹا ہوا ہے اس کا درجہ پست ہے، مگر یہ بلندی اور پستی اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ جو اس معنی میں بلند ہو وہ زیادہ زمین گھیرے یا دولت میں سے زیادہ حصہ پائے، بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ انسان کی نظر میں عزت اور بزرگی کا معیار مال یا نسب نہ ہو بلکہ حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل ہو۔

یہاں مزید تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ اسلام نے اس طرح ان تمام تخیلات کی جڑ کاٹ دی جن پر انسانی سوسائٹی میں اونچے اور نیچے طبقات کا امتیاز قائم ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے ایک طبقہ پیدائشی حق کے طور پر دوسرے طبقہ کو اپنی اغراض کا غلام بناتا ہے۔ قرنِ اوّل کی یہی وہ سب سے بڑی کامیابی تھی جس کی مثال تاریخِ عالم آج تک پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسی تربیت سے وہ قوم پیدا ہوئی تھی جس کے ایک عام فرد کو جب رستم سپہ سالار ایران نے دربار ایران کی شان و شوکت، دولت و ثروت اور عزت و عظمت کے ہوش رُبا نظارے دکھلا کر مرعوب و مبہوت کرنا چاہا تو اس پیوند لگے ہوئے لباس میں ملبوس اور پھٹے ہوئے نیام میں تلوار رکھنے والے سپاہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پائے استقلال میں ذراسی لغزش بھی نہ آسکی۔ وہ سپہ سالار ایران کے جواہرات سے مرصع تخت پر اس کے پاس اس طرح بے تکلف جا بیٹھا جیسے کہ اس کی ساری عمر شاہی درباروں میں ہی گذری تھی۔ اُسے بازو سے پکڑ کر تخت سے نیچے اُتارنے میں عجمیوں نے حماقت کی لیکن وہ اب فرشِ خداوندی پر بھی اُسی بے تکلفی اور آن بان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ گویا مجمع کا سردار وہی ہے اور جب اس کی زبان سے یہ جملے ادا ہوئے:-

"ہم میں یہ دستور نہیں کہ کوئی ایک ہم میں سے خدا بن کر بیٹھ جائے اور باقی اس کے سامنے اس کے بندوں کی طرح ہن کو ہاتھ باندھے کھڑے رہیں۔ ہمارا جو امیر ہے وہ ہمارے برابر ہی فرش زمین پر بیٹھتا ہے۔ اگر اسے ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا خیال آئے تو ہم اسے فوراً معزول کر دیں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ آقا و غلام نہیں ہیں"

تو اس انقلابی آواز کو سُن کر ایرانیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیئں اور طبقاتی امتیازات سے کچلا ہوا ایران اسلامی جمہوریت کے اس مظاہرہ سے دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اس طرح اسلام نے طبقاتی فرق و امتیاز کے عقائد باطلہ کا بت عملی طور پر پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ پھر جب ذہنی اور فکری قوتوں کو اس فتنہ سے نجات مل گئی اور انسان انسانیت کے رتبہ پر پھر سے فائز ہو گیا تو اسلام نے اس فکری آزادی کے حفظ و بقا اور انسان کی طبقاتی تقسیم کی قطعی بیخ کنی کرنے کے لیئے دوسرا قدم بڑھایا۔

(۲) دولتِ عامہ کی عادلانہ و منصفانہ تقسیم Just and equitable distribution of wealth قائم رکھنے کے لیے ایسے تمام کاروبار کی قطعی ممانعت کر دی جس سے بلا زحمت دوسروں کی کمائی پر گھر بیٹھے قبضہ ہو سکے اور ہاتھ پاؤں تک بھی ہلانے نہ پڑیں۔ سود خواری، اجارہ، احتکار اور اکتناز اموال کا حرام قرار دیا جانا انسانیت کے لیے نعمت عظمےٰ سے کم نہ تھا۔ وہ تمام ظالمانہ اور حریصانہ افعال یکدم بند کر دیے گئے جو صدیوں سے انسانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا خون چوس رہے تھے۔ اب سوسائٹی میں کوئی ہوشیار اور چالاک انسان، دھوکہ دفریب سے، بغیر کسی محنت ومشقت کے، دوسروں کی کمائی پر قبضہ نہیں کرسکتا تھا۔ اور دولت عامہ کی غیر منصفانہ تقسیم اس سوسائٹی میں اب ممکن نہ تھی۔

(۳) اس حکم سے ناجائز ذرائع آمدنی کو تو قطعاً بند کردیا گیا جائز ذرائع اور مناسب محنت ومشقت سے حاصل کردہ آمدنی کو مستحسن قرار دیا گیا مگر دولت کا چند افراد یا گروہوں کے پاس جمع ہو جانا پھر بھی سوسائٹی میں مفاسد اور فتن کے پیدا ہو جانے کا باعث ہوسکتا تھا—— ہر جائز سے جائز اور ضروری سے ضروری چیز کا جب غلط استعمال کیا جائے تو اسی چیز سے پھر مفاسد پیدا ہو جایا کرتے ہیں—— اس لئے حد سے زیادہ دولت کا کسی ایک جگہ جمع ہو جانا اسلام نے گوارا نہیں کیا۔ اسی کے تدارک کے لیے زکواۃ فرض کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جائز محنت سے کمائی ہوئی دولت بظاہر انسان کی انفرادی محنت کا پھل ہوتی ہے اس لیے بادی النظر میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ جس نے اپنی محنت سے اس دولت کو کمایا ہے وہی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دار ہے۔ لیکن اسلام اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا کہ کسی شخص کی کمائی ہوئی دولت محض اس کی انفرادی محنت کا ہی ثمر ہوتی ہے۔ برعکس اس کے اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص کی محنت کا بار آور ہونا ان تمام لوگوں کی مشترک محنتوں کا نتیجہ ہوتا ہے جن کے ساتھ اس کا معاشرتی وتمدنی رابطہ ہے۔ لہذا جن لوگوں کی محنتیں زیادہ بار آور ہوئی ہیں ان سے وہ ان لوگوں کا حق رکھوا لیتا ہے جن کی محنتیں کم بار آور ہوئیں یا بار آور نہ ہوسکیں اس حق کو وہ سوسائٹی کے مشترک خزانہ یعنی بیت المال میں جمع کراتا ہے اور خزانہ کے ناظموں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اُن طبقوں تک اسے پہنچائیں جو تقسیم دولت میں اپنا مناسب حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔ اس طریق تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبِ نصاب Haves اور نادار، Have-nots میں اتنا بعد المشرقین باقی نہ رہا جس سے ان میں کسی تصادم کا خطرہ پیدا ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ د

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محنت کی جنگ سے اسلامی ممالک آج تک کبھی آشنا ہی نہیں ہوئے۔ چونکہ جائز حدود کے اندر انفرادی جدوجہد کو کلیتہً مسدود کرنا بھی خلاف فطرت ہے اور ساتھ ہی کسی ایک جگہ دولت کے انبار لگ جانا بھی فطری نظام تمدن کو خراب کر دینے کا موجب ہے، اس لیے اسلام نے نہایت ہی حکمت و دانائی کے ساتھ اس خطرہ کا سدّباب بھی کر دیا اور انفرادی آزادی بھی برقرار رکھی۔ یہ حل فطرت سے اس قدر مطابق اور حکمتوں سے اس قدر پُر ہے کہ بے ساختہ زبان سے سُبْحَانَ اللّٰہِ العلی العظیم نکل جاتا ہے۔

(۴) وراثت کے باب میں دنیا کا عام نظریہ یہ تھا کہ جو دولت ایک مرتبہ ایک جگہ اکٹھی ہو چکی ہے وہ جمع کرنے والے کی وفات کے بعد بھی اکٹھی رہے۔ اسی غرض کے لیے اولادِ اکبر کے حق Right of primogeniture کا اصول وضع کیا گیا، اور بعض جگہ اس میں یہاں تک غلو کیا گیا کہ اگر مرنے والا اولاد نہیں رکھتا تو وہ کسی کو مُتبنّیٰ کر لے تاکہ اس کی جمع کی ہوئی دولت اور فراہم کی ہوئی جائداد ایک ہی جگہ بندھی کی بندھی رہے۔ اسی طرح سوسائٹی کے بعض طبقوں کو مستقل طور پر وراثت کے حق سے محروم بھی کر دیا گیا، مثلاً عورتیں۔ یہ بھی دولت کی غیر عادلانہ تقسیم کو برقرار رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اسلام نے اس حالت کو کُلّیتہً تبدیل کر کے رکھ دیا۔ نہ صرف تمام اولاد ذکور میں ہی باپ کے ترکہ کو تقسیم کیے جانے کا حکم صادر فرمایا بلکہ طبقہ اناث میں صرف بیٹیوں کو ہی نہیں بلکہ بیویوں تک کو بھی محروم نہ رکھا اور بہت سی صورتوں میں قریب و بعید عزیز و اقارب سب ذوی القربا کو بہرہ ور فرمایا۔ کمانے والے کو اپنی زندگی میں اپنی جائز کمائی سے بعد از ادائے زکوٰۃ و صدقات و مبرات، جائز حد تک ہر طرح مستفید ہونے کا حق ضرور دیا۔ لیکن اس کی موت پر باقی ماندہ دولت سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ زیادہ سے زیادہ وسیع کر دیا۔

(۵) اسلام نے اس سوسائٹی کے افراد کو زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت سب ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اجازت دے دی۔ لیکن ان سب کے لیے ایسے حدود مقرر کر دیے کہ کوئی شخص دوسروں کو نقصان پہنچا کر یا اپنی مناسب حد سے تجاوز کر کے کچھ حاصل نہ کر سکے۔ ملازموں نے اپنی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے ہدیہ تک لینے سے احتراز کیا اور قبول ہدیہ کو بھی رشوت میں شمار کیا۔ قارض نے مقروض کی دیوار کے سایہ میں بیٹھنے تک کو سود لینے کا ارتکاب تصور کیا۔ تجارت پیشہ نے اپنے مال کے نقائص خریدار کو دکھلائے بغیر مال فروخت کرنا ناجائز اور حرام خیال کیا۔ زراعت پیشہ نے دوسرے بھائی کے کھیت سے بلا اس کی اجازت گھاس تک کے کاٹنے کو چوری سے تعبیر کیا۔ پھر انصاف کے حصول میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مقدمات کے لیے بھی ایک پیسہ کا خرچ نہ تھا۔ کورٹ فیس، رشوت، بے جا رعب وداب، حاجب و دربان کی منتوں اور وکلاء کی قانون تراشیوں کا دروازہ بند تھا۔ اگر حکمرانِ وقت کے خلاف بھی چارہ جوئی کی ضرورت پیش آتی تھی تو غریب سے غریب مزدور کے لیے بھی کوئی روکاوٹ یا موانع موجود نہ تھے۔ امامت، نکاح خوانی، غمی یا خوشی کی تمام تقریبات انجام دینے کا ہر مسلمان اہل تھا اور ان کاموں کے لیے بھی کسی خاص طبقہ کے مخصوص حقوق تھے اور نہ ان کی انجام دہی کے سلسلہ میں کسی کی جیب پر کوئی بار پڑتا تھا۔ مرنے والوں کو قبر کے لیے زمین بھی مفت ملتی تھی اور اگر میّت کے ورثہ کفن فراہم کرنے کے قابل نہ ہوتے تو کفن بھی بیت المال سے بلاقیمت مل جاتا تھا۔

(۵) اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ حقوق ہمسایہ کو اس قدر وسعت دی گئی کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہمسایہ کے اتنے حقوق بتائے گئے کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں اس کو ترکہ اور وراثت میں شریک نہ کر دیا جائے"۔ مسلمان سے کہا گیا کہ "تیرے لیے اس صورت میں کھانا حرام ہے جب کہ تیرا پڑوسی بھوکا ہو"۔ اس باب میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی کوئی تمیز نہ کی گئی۔ قرآن کا حکم عام تھا کہ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ- نیک سلوک کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ پڑوسی کے ساتھ خواہ وہ قرابت دار ہو یا غیر، پاس بیٹھنے اٹھنے والوں کے ساتھ، مسافر کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جن کو خدا نے تمہارے بس میں کر دیا ہے۔

فلسفیانہ اور اخلاقی مجموعۂ قوانین کے لیے تو کسی قوتِ نافذہ کی ضرورت نہیں ہوا کرتی کیونکہ اس قسم کے اختیاری فرائض کسی سوسائٹی کے تمام افراد کی عملی زندگی پر حاوی ہونے کے لیے وضع ہی نہیں کیے جاتے۔ ان کی حیثیت اختیاری امور کی سی ہوتی ہے۔ جو اشخاص انہیں پسند کریں ان پر عمل پیرا ہو دیکھیں ورنہ بصورتِ دیگر ان پر کوئی الزام نہیں۔ لیکن اسلامی قوانین کی یہ حیثیت نہ تھی۔ وہ اس دنیاوی زندگی میں ایک برتر و اعلیٰ سوسائٹی کی تخلیق و تنظیم کے لیے انسان پر فرض کیے گئے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ان کی پشت پر ایک ایسی قوت ہو جو راستہ سے تمام موانعات کو دور کر دینے اور احکام کو جاری کرنے کی طاقت و صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو۔ چنانچہ حقوق العباد یعنی انفرادی اور اجتماعی انسانی حقوق کو صحیح حدود کے اندر قائم رکھنے کے لیے اسلام نے نہ صرف قوانین دیوانی و فوجداری مرتب کیے بلکہ ان قوانین کے اجراء و عملدرآمد کے لیے ایک قوتِ نافذہ یا ہیئتِ حاکمہ بھی تشکیل کی جسے عرفِ عام میں حکومت اور اسلام کی زبان میں خلافتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس امارتِ اسلامیہ اور عام دنیاوی حکومتوں میں اتنا ہی فرق و امتیاز ہے جتنا کہ خدائی اور انسانی کاموں میں ہوا کرتا ہے۔ یہ خلافتِ اسلامیہ اگرچہ ہر عاقل و بالغ کے ووٹ پر منحصر نہیں تھی لیکن پھر بھی اس میں کسی ایک فردِ واحد کے حقوق کو خواہ وہ کتنا ہی غریب اور دور افتادہ کیوں نہ ہو، پامال کرنے کی قوت باقی نہیں رہنے دی گئی تھی۔ یہ حکومت اگرچہ موجودہ دور کی سی جمہوری حکومتوں کی مانند بھی نہ تھی لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں عوام الناس کے بالمقابل کسی ایک انسان کو بھی اپنی ذات کے لیے تفوق و امتیاز کے خاص حقوق حاصل نہ تھے۔ خلیفۃ اللہ یا امیرالمومنین اپنی رائے و منشاء سے اپنے ہر ایک اس فعل میں جو وہ ملت کی بہبودی کے لیے سرانجام دینا چاہتا تھا مطلقاً آزاد و خود مختار تھا لیکن حدود اللہ سے ـــــ جو نہایت ہی واضح اور بیّن طور پر بیان کر دی گئی تھیں اور جن میں وہ ایک ذرہ بھر بھی کمی بیشی نہیں کر سکتا تھا ـــــ بال بھر بھی اِدھر اُدھر ہونا اس کے لیے محال تھا۔ تمام اسلامی افواج کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بیت المال کے تمام اموال و خزائن اس کے قبضہ و اختیار میں ہوتے تھے۔ ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس کے احکام پر ہی نہیں اشارہ تک پر سرِ تسلیم خم کرنے کو اس حد تک تیار و آمادہ پایا جاتا تھا کہ دنیا بھر میں ایسی تسلیم و رضا، اور فدائیت کی مثالیں نہ پہلے کبھی تھیں اور نہ ہی بعد میں پائی گئیں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ خود احکام خداوندی اور فرامین نبوی کی اطاعت میں سب سے آگے ہوتا تھا۔

قیصر و کسریٰ کے تمام خزائن بیت المال میں جمع ہیں لیکن یہ مختارِ مطلق دوا کے لیے بھی شہد کی ایک معمولی مقدار قوم کی اجازت کے بغیر اس میں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اُن قہار افواج کے مالک کے سامنے جن سے شرق و غرب کانپ رہا تھا، جن کی ایک ضرب کے سامنے قیصر ہرقل گھبرا کر "الوداع" اے شام کہنے پر مجبور ہو گیا تھا، ایک بڑھیا کھڑی ہو کر کہہ دیتی ہے کہ مہر کی مقدار مقرر کرنے کے لیے آپ کا فتویٰ غلط ہے، اور وہ اپنا فتویٰ واپس لے لیتا ہے۔

یہ تو اس نظام حکومت میں مسلمانوں کی حیثیت تھی۔ لیکن رحمتہ للعالمین کے طفیل سے جو سوسائٹی عالم وجود میں آئی تھی اس میں غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو بھی وہ حقوق حاصل تھے جن کے متعلق دشمنوں کی شہادت موجود ہے کہ "غیر مسلم رعایا کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو اُن کو اپنی حکومت میں بھی حاصل ہوتے ممکن نہیں تھے لیکن وہ صرف خلیفہ نہیں بن سکتے تھے"۔ ایک بوڑھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ضعیف ذمی کا اس لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں اسکو دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ذلّت سے بچایا جائے۔ ایک عیسائی نے جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو ان الفاظ میں اپنے متعلق یاد دہانی کرائی کہ "میں وہی عیسائی ہوں جو آج سے قبل فلاں وقت حاضر ہوا تھا" تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فوراً جواب میں فرمایا "میں وہی مسلمان ہوں جس نے تمہارے حسبِ منشا اسی وقت احکام نافذ کر دیئے تھے"۔ ان سب سے بڑھ کر وہ واقعہ ہے کہ جب ایک بدبخت آتش پرست غلام نے حضرت فاروق اعظمؓ کو شہید کر دیا اور ابن عمرؓ نے شدّتِ رنج والم سے مغلوب ہو کر اس مجوسی کو قتل کر ڈالا، تو صحابۂ کرام نے ایسے سخت اور غیر معمولی جوشِ قومی کے موقع پر بھی عدل کو فراموش نہ کیا، اور نئے خلیفہ کے سامنے سب سے پہلا سوال یہی پیش کیا کہ خلیفہ شہید کے بیٹے نے چونکہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر باپ کے قاتل سے خود انتقام لیا ہے اس لیے اس سے قصاص لیا جانا چاہیئے۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور وہ حق پر بھی تھے لیکن پھر بھی ان کو بیت المال سے مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرنی ہی پڑی۔ غور تو کیجیے۔ اس بیسویں صدی میں بھی حاکم قوم کے ایک معمولی فرد کو قتل کر دینے پر پوری قوم آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور قاتل کی پوری قوم پہ عذاب نازل کر دیا جاتا ہے۔ مگر اسلام کی شانِ عدل دیکھیے کہ خلیفۂ وقت اور ملّتِ اسلامی کا نامور ترین ہیرو مار ڈالا جاتا ہے اور پھر بھی پیروانِ اسلام عدل و انصاف کو نہیں بھولتے قاتل کی قوم تو رہی درکنار، خود قاتل سے بھی غیر قانونی انتقام لینے کو جائز نہیں رکھتے۔

عرب کے مفلس و قلّاش بدّو شاہانِ ایران کے محلات میں داخل ہوتے ہیں اور آلِ ساسان کے صدیوں کے جمع شدہ اموال و خزائن، زر و جواہر اور دولت کے انبار اُن کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں مگر ایک سوئی سے لے کر زر و جواہر سے مرصّع طلائی اونٹنی تک صحنِ محل میں بجنسہٖ لاکر جمع کر دی جاتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب اس تمام بیان کو ایک بار پھر پڑھو! ایک ایسی سوسائٹی جس میں جوا، سٹہ[1]، اجارہ، احتکار[1]، بیع غرر[2]، سود اور دوسرے تمام دھوکہ و فریب سے کیے جانے والے کاروبار حرام کر دیے گئے ہوں، جس میں عزیز و اقارب، رشتہ دار و ہمسایہ اور قریب و بعید ہر ایک کے حقوق کی حفاظت کر دی گئی ہو، جس میں دولتِ عامہ کی تقسیم کو صحیح اور مناسب حدود کے اندر رکھ کر کسی ایک جگہ دولت کے انبار جمع ہو جانے کے امکان کا بھی سدِ باب کر دیا گیا ہو، جس میں حکومت سید القوم خادمہم کے اصول پر اس حد تک عمل پیرا ہو کہ لباس، خوراک، رہائش اور آسائش سبھی چیزوں کے لحاظ سے حکمرانِ وقت کی نسبت عام رعایا کو زیادہ خوشحالی، فارغ البالی اور سہولتیں نصیب ہوں، جس میں انصاف مفت، تعلیم مفت، نکاح و طلاق مفت، تجہیز و تکفین مفت، غرض خدمت عمومی کے تمام کام مفت ہوں، جس میں حاجت مند کی ہر حاجت کا کفیل بیت المال ہو، جس میں عامتہ الناس کی اخلاقی تربیت اتنے بلند پیمانہ پر کی گئی ہو جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، کیا ایسی سوسائٹی میں چوروں اور سارقوں کے لیے کوئی جگہ باقی رہ گئی تھی؟ آپ مذکورۂ صدر حالات پر قطعاً خالی الذہن ہو کر غور فرمائیں اور اگر پوری دیانتداری سے غور و خوض کے بعد بھی آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں کہ اس سوسائٹی میں بھی کسی ایک انسان کے چوری پر حقیقتہً مجبور ہونے کا کوئی امکان تھا تو پھر ہم اپنی رائے پر اصرار نہ کریں گے۔ لیکن اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور حقیقتاً اس کا جواب ہے ہی نفی میں، تو پھر آپ خود ہی فرمائیے کہ کیا ایسی سوسائٹی میں سرقہ یا چوری جیسے فعل قبیح کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ کوئی نرمی برتی جا سکتی تھی؟ کیا وہ لوگ بدترین قسم کے مفسد نہ ہوں گے جو ایسے عادلانہ نظام اجتماعی میں رہ کر بھی چوری سے باز نہ آئیں؟ کیا ایسی سوسائٹی میں چوری کرنے والا خود اس بات کا ثبوت بہم نہیں پہنچاتا کہ وہ حاجت سے مجبور ہو کر چور نہیں بنا ہے بلکہ بچھو کی طرح اس کی طینت ہی ناپاک ہے؟ پھر اگر بچھو کے لیے سر کچلنے کی سزا سخت نہیں تو اس بڑے اور زیادہ خطرناک اجتماعی بچھو کے لیے

[1] اجناس کو جمع کر کے روک رکھنا تاکہ قیمتیں گراں ہو جائیں۔ [2] وہ بیع جس میں خریدار کو کسی قسم کا دھوکا دیا جائے ان کو فروخت کر کے نفع کمایا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قطع ید کی سزا کیوں سخت ہو؟

علم النفس کا یہ ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ فطرت کی سختی و شدّت کو انسان گھٹا نہیں سکتا۔ البتہ اسے متعدد جگہ تقسیم کر دے سکتا ہے، اسلامی تعزیری قوانین کو غلطی سے انسان نے آج کل سخت تصور لیا ہے مگر وہ ان کی مزعومہ شدّت کو کم تو نہیں کر سکا البتہ اپنی حماقت سے اس کو متعدد جگہ تقسیم کر کے بنی نوع انسان کو عام طور پر مبتلائے آلام و مصائب ضرور کر دیا ہے اگرچہ ظاہر میں ہر ایک کی تکلیف کی مقدار کم نظر آتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے انسانیت کی روح اس شدت کو یقیناً بہت بڑی طرح محسوس کر رہی ہے۔ جہالت جدیدہ نے اسلامی تعزیرات کو سخت تصوّر کیا اور جرائم کے لئے ہلکی سزائیں تجویز کیں۔ لیکن ان ہلکی سزاؤں کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ شرارت پسند عناصر نے ان کو درخورِ اعتنا بھی نہ سمجھا اور جرائم اور مجرموں کی تعداد روز افزوں ہوتی چلی گئی۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بعض پیشہ ور مجرم اور شدید ترین قسم کے سارق جیل سے رہا ہوتے وقت حکام جیل سے کہہ آتے ہیں کہ ہمارا پیالہ اور کمبل سنبھال کر رکھنا، ہم عنقریب واپس آئے؟ قطع ید کی سزا اگر محض معدودے چند آدمیوں کو دے دی جاتی تو بہت سے انسان چوری کے جرم اور اس کے مادّی و اخلاقی نقصانات، اور جیل کی بدترین زندگی سے بچ جاتے اور ہماری معاشرت میں اس بدترین ادارہ کو زیادہ نشوونما کا موقع نہ ملتا جسے "جیل خانہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس میں بہت سے مختلف قسم کے مجرم مل کر مجرمانہ زندگی کے لیے ایک دوسرے کی تربیت کرتے ہیں۔ چند مجرموں کو اس طرح سختی سے بچا لیا گیا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے لاتعداد انسانوں کو جرائم کی ترغیب ہوئی اور نرالے جرائم کا ارتکاب کرنے کی تدبیریں بھی وہ ایک دوسرے سے سیکھ گئے، اور جیل کی زندگی سے مانوس بھی ہوتے گئے۔ اس پر مزید یہ کہ سوسائٹی کو جرائم کے اس مدرسہ کا خرچ بھی برداشت کرنا پڑا۔ داروگیر اور پکڑ دھکڑ کے لیئے زائد پولیس۔ عدل و انصاف کے لیے مزید عدالتیں، مجرموں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیام وطعام اوران کی نگرانی کے لیے بہت بڑے اسٹاف کے مصارف، اوران سب کے ساتھ کثرتِ جرائم کی وجہ سے جو ذہنی پریشانی قوم کو لاحق رہی اس کا نہ کوئی حساب لگایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی قیمت مشخص کی جاسکتی ہے۔

پھر کیا تہذیب جدید کی پیدا کردہ سوسائٹی آج کل شدید سزاؤں سے ہر معاملہ میں اجتناب کر رہی ہے؟ قطعاً نہیں۔ جرمنی اور بعض دوسرے ممالک میں تہذیب اور قوم کے نام پر موروثی امراض کے مریضوں اور ناکارہ افراد کے لیے آج جو قانون نافذ ہے کیا وہ قطع ید کی سزا سے کم سخت ہے؟ اس کا نام Eugenics "تولیدِ نسلِ صالح" رکھ دیجیے اور اس مہذب نام سے لوگوں کے صنفی اعضا کی کانٹ چھانٹ کیجیے تو کوئی عیب نہیں۔ لیکن تولید جماعت صالحہ کے لیے یہی قطع اعضا کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ عیب ہے اور اس کو وحشت اور بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے! یہ اگر بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تہذیب کے دور میں سزا سے انتقام مقصود نہیں ہے بلکہ اصلاح اور تبدیلیٔ قلب مقصود ہے، لہٰذا مہذب ممالک کے جیل خانوں میں سخت سزاؤں کی بہ نسبت مجرم کی اصلاح پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تاکہ مجرم ان جیل خانوں سے بہتر شہری اور زیادہ دیانت دار انسان بن کر نکلیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور مغرب زدہ انسانوں کی فطرت اُلٹی واقع ہوئی ہے۔ وہ دُکھ درد کی پکار پر اس وقت تک کان نہیں دھرتے جب تک کہ انسان اپنے ساتھ خود ان کو بھی لے مرنے کی نہ ٹھان لے جب علاج کا وقت ہوتا ہے تو یہ مجرمانہ غفلت اور بے پروائی سے کام لیتے ہیں، اور جب پانی سر سے گذر جاتا ہے تو پھر علاج کی فکر کرتے ہیں۔ ان کی یہ حالت صرف سیاست ہی میں نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسی پر اُن کا عمل ہے۔ مجرموں کی اصلاح کی کوشش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام سے زیادہ اور کون کرے گا؟ لیکن صحیح اصلاح کا وقت وہ نہیں ہوتا جب مجرم جرم کا ارتکاب کر کے سزا کا مستحق ہو چکا ہو، بلکہ اس کا صحیح وقت بطنِ مادر سے نکلنے کے بعد اور جیل میں داخل ہونے سے پہلے ہے۔ افراد قوم کی اخلاقی اور ذہنی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی بُرائیاں دب جائیں اور بھلائیاں چمک اُٹھیں۔ سوسائٹی کا نظام ایسا بنایا جائے کہ اس میں کسی کو اپنی حقیقی ضروریات کے لیے جُرم کرنا ہی نہ پڑے۔ یہی طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے۔ وہ اس وقت سے مجرم کی اصلاح کا طالب ہوتا ہے جب کہ اس نے ابھی آغوشِ مادر میں آنکھیں ہی کھولی ہوں۔ وہ قرآن اور سُنّتِ رسول کے ذریعہ سے اس کو بہترین اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے ساتھ اجتماعی زندگی میں خرابی کے تمام اسباب و علل کی چھان بین کر کے ایسی فضا پیدا کر دینا چاہتا ہے کہ اس میں جرائم کا نشو و نما ہی نہ ہو سکے۔ اس طرح ارتکابِ جُرم اور گرفتاری سے پہلے وہ اصلاح کی تمام تدبیریں پوری کر لیتا ہے۔ پھر جب ان سب کے باوجود جرم کا ارتکاب ہو جائے تو اس صورت میں اسلام کو اس فردِ واحد کی اصلاح کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی ان دوسرے بہت سے افراد کو جنہوں نے ابھی جُرم نہیں کیا ہے، ارتکابِ جرم سے بچانے کی فکر ہوتی ہے۔ جس طرح تولیدِ نسلِ صالح کا حامی Eugenist کہتا ہے کہ موروثی بیماریاں اور دماغی و اخلاقی خرابیاں جن لوگوں میں پائی جاتی ہیں اُنہیں خصی کر دو تاکہ ان کی خرابی دوسروں میں منتقل نہ ہو، اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ جو شخص چوری اور زنا جیسے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اس پر ایسا آپریشن کرو کہ سوسائٹی کے دوسرے افراد، جن میں ایسے ہی جرائم کی استعداد پوشیدہ ہے، اس جُرم کی چھوت لگنے سے بچ جائیں۔

مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ یہ آپریشن کرنے کے بعد اسلام اُس شخص کی اصلاح حال سے غافل ہو جاتا ہے جس پر آپریشن کیا گیا ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا چور اور چورنی دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

بدلہ ہے ان کے اس کرتوت کا۔ یہ تعزیر ان کے حق میں خدا کی طرف سے قرار پائی ہے اور خدا زبردست حکمت والا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کر لے اور اپنی اخلاقی حالت سنوار لے تو اللہ بھی رحمت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جرم کیا اور اس کی سزا بھی مل گئی۔ اب اگر آئندہ کے لیے ارتکاب جرائم سے باز آجائے اور اپنی حالت درست کر لے تو اس کو دوبارہ عزت کا مقام مل سکتا ہے۔ مزید برآں اسلام نے مجرم کی اس اصلاح کا بار تنہا اس کی اپنی ذات پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی جائز امداد کے لیے خلافت الٰہیہ جناب تک اس کی مادی و اخلاقی فلاح و بہبود اور اصلاح کی ضامن تھی آمادہ و مستعد رہے گی۔

مغرب کے تمام مہذب ممالک میں تہذیب جدید کے پیدا کردہ نئی قسم کے اصلاحی جیل خانے قائم ہیں۔ تمام سائنٹفک ایجادات اور علوم و فنون کے اشتراک عمل سے انسداد جرائم کے لیے سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ لیکن نتائج اس قدر حیرتناک ہیں کہ خود مغرب کے دوربین اور دور اندیش انسان کثرت جرائم پر آنسو بہا رہے ہیں۔ ہم اس موضوع پر بہت کچھ خامہ فرسائی کر سکتے ہیں لیکن یہاں صرف ایک بیان پر ہی اکتفا کریں گے۔

کرنل لنڈبرگ مشہور دولتمند امریکی ہوا باز ہے۔ بڑی منتوں اور آرزوؤں کے بعد اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جو ماں باپ کو اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا۔ مہذب ملک امریکہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ مجرموں نے لنڈبرگ کی دولت میں سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہا اس لیے انہوں نے اس بچے کو چرا لیا، اور اپنی قوم کے اس نامور ہیرو کو مطلع کر دیا کہ فلاں وقت اور فلاں جگہ اتنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رقم بھجوا دو تو تمہارا لڑکا تمہیں زندہ وسلامت واپس مل جائے گا ورنہ اس کی جان سے ہاتھ دھو بو۔ مہذب اور متمدن امریکی حکومت نے ان مجرموں کو گرفتار کرنے اور بیچارے کرنل کو اس جبری جرمانے سے بچانے کے لیے سارے ہی جتن کر ڈالے۔ لیکن وہ کرنل صاحب کو ان کا لڑکا واپس نہ دلا سکی۔ یہاں تک کہ اس معصوم بچہ کے خون سے غالباً ان ظالموں نے ہاتھ رنگ ہی لیے۔ اب وہ بیچارہ غریب اس مجرم گروہ کی دراز دستیوں کے خوف سے بارہ مہینے یورپ کے مختلف ممالک کی خاک چھانتا پھر رہا ہے تاکہ اپنے دوسرے بچے کی جان بچا سکے۔ اُسے کسی ایک جگہ قرار نہیں کبھی کسی ملک میں اور کبھی کسی ملک میں چھپنے اور پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے جیسے ایک خرگوش شکاری کتوں سے بچنے کے لیے ہر جھاڑی اور ہر درخت کی آڑ تلاش کیا کرتا ہے۔ یہ وہی ہوا باز کرنل ہے جو ہوا بازی کا ریکارڈ قائم کرنے کی وجہ سے امریکن پبلک میں بہت ہر دلعزیز ہو چکا ہے۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس مہذب ملک میں جب اتنے بڑے آدمیوں کے ساتھ یہ کچھ ہو سکتا ہے تو نسبتاً کم درجہ کے لوگوں پر کیا گذرتی ہو گی۔

اب اسلامی حکومت کا حال دیکھیے۔ اسلام کی اصلی حکومت قرن اوّل کے تیس سال تک رہی اور یہی وہ مبارک زمانہ تھا جس میں اسلامی قانون اپنے تمام جزئیات کے ساتھ نافذ ہوا۔ اس دور میں اسلام کے قوانین کو عمل میں لا کر اور خالص اسلامی اصول پر سوسائٹی کا نظام مرتب کر کے دنیا کو دکھا دیا گیا تاکہ بعد میں یہ سوال ہی نہ اٹھ سکے کہ ان قوانین پر عمل بھی ممکن ہے یا نہیں؟

اس حکومت کو انتظام مملکت کے لیے وہ زبردست ذرائع حاصل نہ تھے جو آج بیسویں صدی کی ترقی یافتہ حکومتوں کو حاصل ہیں۔ نہ ٹیلیفون۔ نہ تار۔ نہ بے تار برقی۔ نہ موٹر۔ نہ ریل۔ نہ ہوائی جہاز نہ سراغرسانی کے جدید فنون۔ مگر اس کے باوجود اس کی قلمرو میں جہاں دو دو سو میل تک پولیس کی ایک چوکی بھی نہ ہوتی تھی، مجرموں کے منظم جتھوں کا کہیں نشان نظر نہیں آتا۔ لوٹ مار، ڈاکہ زنی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرقہ اور نقب زنی کے واقعات شاذ و نادر کہیں پائے جاتے ہیں۔ یمن سے لے کر عراق تک ریگستان عرب میں ایک عورت تنہا چلی جاتی ہے اور کوئی اس سے تعرض کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس حیرت انگیز امن و امان کے مقابلہ میں یورپ اور امریکہ کی موجودہ بدامنی کو دیکھیے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ امن قائم کرنا اسلامی قانون کا طرۂ امتیاز ہے یا مغربی قوانین کا؟

قرن اول کو چھوڑیے۔ آج نجد و حجاز میں اسلامی حکومت کا محض ایک دھندلا سا خاکہ ہی قائم ہے۔ صدیقؓ و فاروقؓ کے عہد کی سی سوسائٹی موجود نہیں ہے مگر اسلامی تعزیرات ضرور نافذ ہوتے ہیں۔ ان کی برکت دیکھیے کہ ریگستان میں پڑی ہوئی اشرفی کو ایک بدو ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ لاکھوں روپے کا خزانہ یونہی اونٹوں پہ لاد کر ساربانوں کے ہاتھ ریاض سے کویت تک چلا جاتا ہے۔ کوئی پولیس اور فوج ساتھ نہیں ہوتی۔ مگر کیا مجال جو کوئی خزانہ کے اونٹوں کو چھیڑ بھی سکے۔ اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اسلامی تعزیرات کے فائق و برتر ہونے کی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے باوجود اگر مسلمان اسلامی قوانین پر یورپ کے جاہلانہ اعتراضات کو سن کر گھبرائیں اور یہ کہتے ہوئے شرمائیں کہ ہمارے قانون میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو اس کو غلامانہ ذہنیت کے سوا کسی دوسری چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا دماغ یورپ کا غلام نہیں ہے اس کو تو جرأت کے ساتھ کہنا چاہیے کہ دنیا میں حقیقی امن اسلام اور صرف اسلام ہی کے قانون سے قائم ہو سکتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ صرف اس قانون کے صحیح ماحول Proper environments کی وضاحت تھی۔ اسلامی شرعی احکام سارق کے بارے میں اس وقت تک بیان نہیں کیے گئے۔ ہم نے اسلامی قانون کی عقلی و علمی بنیادوں پر بحث کرنے میں جو اس قدر وقت صرف کیا اس کی وجہ محض یہ ہے کہ لوگ عموماً اس پہلو سے خالی الذہن ہیں اور ان کو صحیح فہم و بصیرت حاصل کرنے کے لیے اتنی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے ورنہ ہم کسی اندرونی اح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونائت (INFERIORITY COMPLEX) میں مبتلا نہیں ہیں کہ ان تشریحات کے بغیر یہ اعلان کرنے کی جرأت نہ کر سکتے ہوں کہ ہاں اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ اگر ہم اس بیماری میں مبتلا ہوتے تو حقیقت کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے گناہگاروں کی طرح صفائی پیش کرنے کا طریقہ Apologetic attitude اختیار کرتے جیسا کہ اپنی کمزوریٔ ایمان کی وجہ سے ہر میدان میں اس وقت مسلمان اختیار کر رہے ہیں۔

اب مختصراً اہم سرقہ کے متعلق اسلامی قانون کی تفصیلات بھی بیان کیے دیتے ہیں:۔

(۱) قطع ید کی سزا کے لیے عاقل اور بالغ کی شرط ہے۔ غیر عاقل اور نابالغ کے لیے یہ سزا نہیں ہے (بالاجماع)

(۲) ایک مقررہ مالِ نصاب سے کم پر یہ سزا نہیں ہے اور نصاب سرقہ کی مقدار میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

(۳) نصابِ سرقہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دس درہم، امام شافعی کے نزدیک ربع دینار، اور امام مالک کے نزدیک تین درہم ہے۔

(۴) ایک نصابِ سرقہ میں اگر کئی آدمی شامل ہوں تو کسی کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ امام مالک کا مذہب اس کے خلاف ہے۔

(۵) امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان چیزوں میں قطع ید کی سزا نہیں ہے:۔ گھاس، لکڑی، بانس، مچھلی، پرندے، شکار، مٹی، چونا، کھانے پینے کی چیزیں، روٹی، دودھ، گوشت، ترمیوہ، درختوں پر لگے ہوئے پھل، اشربہ وغیرہ۔

© rasailojaraid.com